دعائے ندبہ
ایک علمی و تنقیدی جائزہ

مولف: حجت الاسلام سید علی احمد موسوی واعظ

وجدان پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ والصلاۃ علی رسول اللہ وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

یہ جان لینا چاہیے کہ ہماری قوم کو دین اور دنیا (دونوں) سے محروم کر دیا گیا ہے؛ اور اب ہر شخص ملت کی ہمدردی کا حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ عوام خادم اور خائن میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ تو ان خرافات کی وجہ سے جو اس نے مذاہب میں دیکھ لی ہیں، کلی طور پر دین سے بیزار ہو چکا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اپنی عقلیں خرافات کے مبلغین کو کرائے پر دے رکھی ہیں اور ان کے افکار اوہام و خرافات سے بھرے ہوئے ہیں؛ چنانچہ اگر کوئی شخص حقائقِ اسلام میں سے کوئی حقیقت بیان کرے، تو وہ اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں اور اس پر سینکڑوں بہتان اور تہمتیں تراشتے ہیں، اور منبروں و محفلوں میں اسے نشانہ ملامت بناتے ہیں تاکہ لوگوں کو اس سے بدظن کر دیں اور کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔

اس صورتحال کے باوجود ہم مایوس نہیں ہیں، اور صاحبِ علم دینداروں اور بیدار مغز علمائے ابرار سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عوامِ الناس کو "دکاندار بھیڑیوں" کے چنگل سے

چھڑائیں اور دینِ اسلام میں داخل ہونے والی بدعات کو لوگوں کے سامنے واضح کریں۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے روایت ہے (جیسا کہ سفینۃ البحار، جلد دوم، ص 57 میں مذکور ہے) کہ آپ نے فرمایا: «سیأتی زمان السنۃ فیھم بدعۃ والبدعۃ فیھم سنۃ...» الخ۔ یعنی: "عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کے درمیان سنتِ (نبوی) کو بدعت سمجھا جائے گا اور بدعت ان کے ہاں سنت بن جائے گی۔ ہر جاہل ان کے نزدیک صاحبِ علم و خبر ہوگا، وہ مخلصِ مومن اور شک کرنے والے میں تمیز نہ کر سکیں گے اور نہ ہی بھیڑ اور بھیڑیے کی پہچان رکھ پائیں گے۔ ان کے علماء روئے زمین پر خدا کی بدترین مخلوق ہوں گے، کیونکہ وہ فلسفہ اور (بافی گئی) تصوف و عرفان کی طرف مائل ہوں گے"۔

ایسے حالات میں ان لوگوں پر لازم ہے جو قرآن اور الٰہی عقائد سے واقف ہیں کہ وہ عوام کو منافقین کے شکنجے سے نکالنے کے لیے تمام تر مصائب اور تلخیوں کے باوجود جدوجہد کریں، تاکہ وہ اپنی الٰہی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں اور اجرِ جزیل کے مستحق ٹھہریں۔ ہم نے اس مختصر رسالے میں قوم کی بیداری کے لیے **"دعائے ندبہ کا علمی جائزہ"** لیا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ دعا بے سند، بدعت، اور عقل و قرآن کے منافی ہے، نیز اس کے مضامین کفر و شرک پر مبنی ہیں۔

دعائے ندبہ کے بے سند ہونے کا بیان

اس دعا کی کوئی ایسی سند یا ثبوت موجود نہیں ہے جو اسے کسی امام یا رسول اللہ ﷺ تک پہنچائے، اور اس حقیقت پر سرے سے کوئی مدرک (دلیل) موجود ہی نہیں۔ اب اگر کوئی سند کا مدعی ہے تو اسے چاہیے کہ دو اہل علم کی موجودگی میں ہمیں وہ سند دکھائے۔ حاج شیخ عباس قمی نے 'مفاتیح الجنان' میں اسے درج کر کے غفلت اور فروگزاشت سے کام لیا ہے اور اس کے لیے کوئی ٹھوس مدرک بھی ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے، علامہ مجلسی اور دیگر محدثین نے اس دعا کو ابن طاؤس کی کتاب سے نقل کیا ہے، اور چونکہ مستحبات کے معاملے میں یہ حضرات "تسامح" (نرمی) برتتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس تحقیق کی زحمت نہیں کی کہ ابن طاؤس نے اسے کس سے نقل کیا ہے۔

آپ خود جا کر تحقیق کریں، ابن طاؤس نے یہ دعا امام یا رسول سے نقل نہیں کی، بلکہ اسے بعض "مجہول الحال" شیعہ افراد سے روایت کیا ہے۔ ان کی کتاب کی عبارت یوں ہے:

«ذكر بعض أصحابنا قال: قال محمد بن علي بن أبي قرة: نقلت من كتاب محمد بن الحسين بن سفيان البزوفري دعاء الندبة وذكر أن الدعاء لصاحب الزمان».

ابن طاؤس کی اس عبارت سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

اول: سید (ابن طاؤس) نے ان "بعض اصحاب" کی وضاحت نہیں کی جن سے انہوں نے یہ نقل کیا ہے، کہ وہ کون ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔

دوم: 'محمد بن حسین بن سفیان' کو کتبِ رجال کے مصنفین نے مجہول الحال قرار دیا ہے۔

سوم: محمد بن حسین بن سفیان چوتھی صدی ہجری میں تھے، وہ ائمہ کا زمانہ نہیں تھا کہ انہوں نے براہِ راست امام سے یہ دعا لی ہو؛ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ دعا کہاں سے اور کس سے حاصل کی۔ انہوں نے نہ کسی امام کا نام لیا ہے اور نہ کسی اور کا۔ خود حاج شیخ عباس قمی اپنی کتاب 'ہدیۃ الاحباب' (ص 106) میں لکھتے ہیں کہ اسی محمد بن حسین سفیان نے دعائے ندبہ کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

چہارم: وہ کہتے ہیں کہ "یہ دعا صاحب الزمان کے لیے ہے"؛ بہت خوب، لیکن یہ بیان نہیں کیا کہ کس دلیل یا مدرک کی بنیاد پر؟

پس ثابت ہوا کہ ابن طاؤس نے (جیسا کہ بحار الانوار جلد 22 ص 262 میں ان سے منقول ہے) کوئی صحیح مدرک پیش نہیں کیا اور ممکن ہے کہ انہوں نے "تسامح در ادلۂ سنن" (سنتوں کے دلائل میں نرمی) کے قاعدے کے تحت اسے درج کر دیا ہو اور باقیوں نے انھی کی پیروی اور اعتماد کیا۔ حالانکہ یہاں "تسامح در ادلۂ سنن" کا اطلاق ہی نہیں ہوتا، کیونکہ یہ قاعدہ

وہاں برتا جاتا ہے جہاں سند ضعیف ہو مگر موجود ہو، تو مستحب ہونے کی بنا پر ضعف سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے۔ لیکن یہاں تو سرے سے کوئی ضعیف سند بھی ذکر نہیں ہوئی، لہٰذا تسامح کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر کوئی ہماری بات تسلیم نہیں کرتا تو جائے اور تحقیق کرے؛ اگر وہ کوئی معتبر مدرک لے آئے تو ہم اسے دس ہزار روپے بطور حقِ زحمت دیں گے، اور اگر اسے کوئی دلیل نہ ملے تو پھر اسے بدگوئی، ہنگامہ آرائی اور افتراپردازی سے گریز کرنا چاہیے۔

پس اس دعا کی کوئی شرعی سند نہیں ہے، اور عقلی طور پر بھی یہ ناممکن ہے کہ اسے ائمہ میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جائے۔ کیونکہ پہلے سے لے کر گیارہویں امام تک، جو تمام کے تمام عاقل اور کامل تھے، وہ جانتے تھے کہ بارہویں امام ابھی پیدا نہیں ہوئے اور نہ ہی غائب ہوئے ہیں۔ تو جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا، اسے اس دعا میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ:

> «لیت شعری أین استقرت بک النوی...» یعنی: "کاش میں جان سکتا کہ تمہاری منزلِ مقصود کہاں ہے، یا کس زمین اور مٹی نے تمہیں اپنے دامن میں لے رکھا ہے؟ کیا تم کوہِ رضویٰ میں ہو یا کہیں اور؟ کیا تم ذی طویٰ میں ہو یا کسی اور جگہ؟ میری جان تم پر فدا ہو، تم وہ غائب ہو جو ہم سے دور نہیں"۔

کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ چھٹے یا دسویں امام (یا کوئی بھی امام) اپنے اس پوتے یا پڑپوتے کے لیے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا اور غائب نہیں ہوا، یہ کہیں کہ: "تم کہاں ہو؟ میں آکر تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے کس پہاڑ میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے؟" کیا ائمہِ ہدیٰ نہیں جانتے تھے کہ وہ ابھی پیدا نہیں ہوئے اور نہ ہی کوہ نشین ہوئے ہیں؟ الا یہ کہ کوئی یہ کہے کہ خود بارہویں امام نے یہ دعا اپنے لیے پڑھی ہے اور اپنی ہی جدائی میں گریہ و زاری (ندبہ) کر رہے ہیں! کیا یہ ممکن ہے کہ امامِ عصر کو اپنی ہی جگہ معلوم نہ ہو اور وہ کہیں: "کاش میں جان پاتا کہ تم (یعنی میں خود) کہاں ہو اور کس زمین نے تمہیں (یعنی مجھے) چھپا رکھا ہے؟"

کیا وہ لوگ حیا نہیں کرتے جو یہ دعا ان کی طرف منسوب کرتے ہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ اپنے امام کو (معاذ اللہ) عاقل بھی نہیں سمجھتے۔

دعائے ندبہ کے بدعت ہونے کا بیان

بدعت ان عقائد اور اعمال کو کہا جاتا ہے جو اسلام میں (اصلاً) موجود نہ تھے اور رسول اللہ ﷺ و ائمہ ہدیٰ کے بعد ایجاد کر کے ان کی طرف منسوب کر دیے گئے۔ بالکل اسی دعائے ندبہ کی طرح جو رسول اللہ ﷺ اور ائمہ کے زمانے میں موجود نہ تھی اور اس دور میں کسی نے اسے نہیں پڑھا، اور نہ ہی محمد بن حسین بزوفری کے زمانے سے پہلے کسی تاریخ یا مدرک میں اس کا کوئی ذکر ملتا ہے۔

قطب راوندی نے کتاب 'نوادر' میں، علامہ مجلسی نے 'بحار الانوار' (جلد 16، ص 32) میں اور محدث قمی نے 'سفینۃ البحار' (ص 63) میں دیگر اکابرینِ دین کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

«من عمل في بدعة خلاه الشيطان والعبادة وألقى عليه الخشوع والبكاء»

یعنی: "جو شخص کسی بدعت پر عمل یا (بدعت کو) عبادت بنا کر لاتا ہے، شیطان اسے اسی عبادت کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس پر (مصنوعی) خشوع اور گریہ طاری کر دیتا ہے"۔

۲- انہیں کتب میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«أبى الله لصاحب البدعة بالتوبة»

یعنی: "اللہ تعالیٰ بدعتی کی توبہ قبول نہیں فرماتا"۔

۳- انہیں کتب میں حلبی سے روایت ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: "انسان کو کفر سے قریب تر کرنے والی چیز کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: **"بدعت ایجاد کرنا، پھر اس کی طرفداری کرنا اور اس کے موافق چلنے والے سے دوستی اور مخالف سے دشمنی رکھنا"**۔ (جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے کہ جو کوئی اس بدعت آمیز دعا کو پڑھے اور ان کا ہم نوا بنے، اسے یہ لوگ اپنا دوست سمجھتے ہیں)۔

۴- امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "جو بدعت ایجاد کرے وہ ناصبی، مشرک اور کافر ہے، لیکن وہ خود اس حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے"۔

۵- کتاب 'کافی' میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

«إذا رأيتم أهل الريب والبدع فأظهروا البراءة منهم وأكثروا من سبهم»

یعنی: "جب تم میرے بعد شک کرنے والوں اور بدعتیوں کو دیکھو، تو ان سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کرو اور ان کی (کرتوتوں کی) بھرپور مذمت کرو"۔

٦- بحار الانوار (جلد 11، ص 169) اور دیگر معتبر کتب میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "گناہانِ کبیرہ میں سے ایک 'بدعت' ہے"۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«من تبسم في وجه بتدرع فقد أعان على هدم دينه»

یعنی: "جس نے کسی بدعتی کو دیکھ کر تبسم کیا، اس نے یقیناً اپنے دین کو ڈھانے میں مدد کی"۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إن من مشى إلى صاحب بدعة فوقره مشى في هدم الإسلام»

یعنی: "جو کسی بدعتی کی طرف چل کر گیا اور اس کی توقیر کی، وہ درحقیقت اسلام کی بربادی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے"۔

اور ایسی بے شمار روایات ہیں جن کی اس مختصر رسالے میں گنجائش نہیں۔ پس وہ لوگ جو 'مہدیہ' تعمیر کرتے ہیں، عوام کے سامنے دعائے ندبہ پڑھتے ہیں اور لوگوں کو "امامِ زمانہ کا کتا" بنا کر ان سے (کتوں کی طرح) آوازیں نکلواتے ہیں، وہ اہل بدعت اور امام کے دشمن ہیں۔ کیا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اسلام کے اندر کوئی 'مہدیہ'، 'زینبیہ'، 'خانقاہ' یا 'صومعہ' (عبادت گاہیں) موجود تھیں؟ اور کیا مومن کا شرف "کتا بننے" میں ہے یا "حقیقی انسان" بننے میں؟ جبکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ العزة لله ولرسوله وللمؤمنين ﴾ (عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے)۔

جائے تعجب ہے کہ کس طرح اکثر لوگ بدعت کی طرف مائل ہیں اور بدعت کی مجالس میں رغبت رکھتے ہیں! سید مرتضیٰ، مقدس اردبیلی اور دیگر نے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

«سیأتی زمان السنة فیهم بدعة والبدعة فیهم سنة»

یعنی: "لوگوں پر ایسا وقت آئے گا جب ان کے درمیان اللہ اور رسول کی سنت بدعت کہلائے گی، اور بدعت ان کے نزدیک سنت بن جائے گی"۔

دعائے ندبہ اور قرآن کا باہمی تضاد

دعائے ندبہ کے متعدد جملے قرآنِ حکیم کی صریح آیات کے منافی ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ادعا:

اس دعا میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں کہا گیا ہے: «وسألک لسان صدق فی الآخرین فاجبتہ و جعلت ذلک علیاً» یعنی: "ابراہیمؑ نے تجھ سے سوال کیا کہ آنے والی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رہے، تو نے ان کی دعا قبول کی اور اس (ذکرِ خیر) کو 'علی' قرار دیا"۔

یہ قرآن اور حضرت ابراہیمؑ پر صریح بہتان ہے۔ سورہ شعراء (آیت ۸۴) میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا یوں منقول ہے: ﴿ وَٱجۡعَل لِّي لِسَانَ صِدۡقٖ فِي ٱلۡأٓخِرِينَ ﴾ (اور میرے لیے پچھلوں میں سچائی کی زبان یعنی ذکرِ خیر قرار دے)۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آنے والی امتیں ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کریں اور ان کی طرف جھوٹ منسوب نہ کریں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور آج تمام امتیں (یہود، نصاریٰ اور مسلمان) ان کی عقیدت مند اور انہیں 'بت شکن' تسلیم کرتی ہیں۔ اس کا جملہ «وجعلت ذلک علیاً» سے کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ اللہ نے قرآن میں کہاں فرمایا کہ ابراہیمؑ کا مقصود 'علی' تھے؟ "اسے علی قرار دیا" کے کوئی معنی ہی نہیں بنتے؛ بلکہ سورہ مریم میں لفظ 'علیًا' سے مراد تمام انبیاء کے ذکرِ خیر کی بلندی اور رفعت ہے۔

۲۔ معراج اور وسعتِ سفر کا مسئلہ:

دعا کا جملہ «أوطأته مشارقك ومغاربك وعرجت بروحه إلى سمائك» (تو نے اسے اپنے مشارق و مغارب کی سیر کرائی اور اس کی روح کو اپنے آسمان کی طرف بلند کیا) کئی جہتوں سے قرآن کے خلاف ہے:

- **اول:** جملہ «أوطأته مشارقك ومغاربك» سورہ اسراء کی پہلی آیت کے خلاف ہے جس میں اللہ نے فرمایا: ﴿ سُبۡحَٰنَ ٱلَّذِيٓ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ لَيۡلٗا مِّنَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ إِلَى ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡأَقۡصَا ﴾۔ اللہ نے اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصی تک کی سیر کرائی، نہ کہ تمام مشرقوں اور مغربوں کی۔
- **دوم:** زمین کے مشارق و مغارب تو ہیں، مگر اللہ کے لیے مشارق و مغارب کا تصور (خدا کو ان کے درمیان محدود کرنا) درست نہیں۔
- **سوم:** جملہ «عرجت بروحه» (اس کی روح کو معراج کرائی) قرآن اور ضرورتِ اسلام کے خلاف ہے۔ قرآن فرماتا ہے: ﴿ أَسۡرَىٰ بِعَبۡدِهِۦ ﴾ (اپنے بندے کو سیر کرائی)۔ 'بندہ' روح اور جسم کے مجموعے کو کہتے ہیں، تنہا روح کو بندہ نہیں کہا جاتا۔ تمام علمائے اسلام بالخصوص علمائے شیعہ کا اجماع ہے کہ معراج جسمانی تھی نہ کہ محض روحانی۔ اگر معراج محض خواب یا روح کی سیر ہوتی تو اہل حجاز اس پر تعجب یا انکار نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعائے ندبہ کا خالق شیخیہ جیسے فلسفیانہ مکاتبِ فکر سے متاثر تھا۔

۳۔ علمِ غیب کا مسئلہ:

دعا میں کہا گیا: «وأودعته علم ما كان وما يكون...» (تو نے اسے گذشتہ اور آئندہ کا تمام علم سپرد کر دیا)۔ قرآن کی کئی آیات اس کے برعکس ہیں:

- سورہ اعراف میں ہے: ﴿ قُلۡ إِنَّمَا عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّي ﴾؛ نبی ﷺ اعتراف فرما رہے ہیں کہ قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔
- سورہ لقمان کے آخر میں پانچ غیبی علوم (قیامت، بارش، ارحام، کل کا حال، مقامِ موت) کو اللہ نے اپنی ذات تک منحصر فرمایا ہے۔ حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ (خطبہ ۱۲۸) میں صراحت فرمائی کہ یہ پانچ چیزیں نہ پیغمبر جانتے ہیں نہ ان کا وصی۔
- سورہ توبہ میں منافقین کے بارے میں فرمایا: ﴿ لَا تَعۡلَمُهُمۡ نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ ﴾ (آپ انہیں نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں)۔
- سورہ احقاف میں فرمایا: ﴿ وَمَآ أَدۡرِي مَا يُفۡعَلُ بِي وَلَا بِكُمۡ ﴾ (میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہوگا)۔ جب قرآن صراحت کر رہا ہے کہ آپ ﷺ کو صرف 'قلیل علم' دیا گیا (سورہ اسراء) اور سورہ کہف میں ایک سوال کا جواب وحی کے انتظار میں چالیس دن تک رکا رہا، تو "علمِ ماکان و مایکون" کا دعویٰ قرآن کی ضد ہے۔

۴- اجرِ رسالت اور مودتِ قرآنی:

دعا کا یہ جملہ کہ "محمد ﷺ کی رسالت کا اجر ان کے اہل‌بیت کی مودت قرار دیا گیا"؛ قرآن کی متعدد آیات کے خلاف ہے۔ قرآن میں کئی جگہ (سورہ یوسف، سورہ ص، سورہ شعراء) انبیاء کی زبان سے کہلوایا گیا: ﴿ إِنۡ أَجۡرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ (میرا اجر تو صرف رب العالمین کے ذمے ہے)۔

قرآن میں تناقض نہیں ہو سکتا کہ ایک جگہ کہے 'اجر نہیں مانگتا' اور دوسری جگہ کہے 'اہل‌بیت کی محبت کی صورت میں اجر مانگتا ہوں'۔ دراصل سورہ شوریٰ (آیتِ مودت) مکہ میں نازل ہوئی، جب نہ امام حسن و

حسین پیدا ہوئے تھے اور نہ آیہ تطہیر نازل ہوئی تھی۔ وہاں مخاطب مشرکینِ مکہ تھے، جن سے آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نے فرمایا تھا کہ اگر تم ایمان نہیں لاتے تو کم از کم میرے اور اپنے درمیان موجود قرابت و رشتہ داری (خویشی) کا تو لحاظ کرو اور مجھے اذیت نہ دو۔ مشرکین جو آپ کی رسالت ہی کے منکر تھے، وہ آپ کی عترت سے محبت کو اجرِ رسالت کے طور پر کیسے قبول کر سکتے تھے؟ لہٰذا مفسرین نے یہاں 'الا' کو 'بل' (بلکہ) کے معنی میں لیا ہے، ورنہ آیت کے معنی لغو ہو جاتے ہیں۔

عقل کے ساتھ اس دعا کا پہلا تضاد یہ ہے کہ اسے بیک وقت ہزاروں مقامات، مساجد اور گھروں میں پڑھا جاتا ہے۔ کیا امامِ زمانہ (خدا کی طرح) ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر پکار کو سننے والے ہیں؟ یقیناً نہیں؛ کیونکہ امام خدا کی صفات کا حامل نہیں ہوتا۔ خود امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ہے: «سبحان الله عن صفات المخلوقين» (اللہ کی ذات مخلوق کی صفات سے پاک ہے)۔ اور اگر وہ ہر جگہ حاضر نہیں ہیں، تو پھر اس دعا میں انہیں کیوں پکارا جاتا ہے اور کیوں کہا جاتا ہے: «یا بن السادات المقربین یابن النجباء الأكرمين» (اے مقرب سادات کے فرزند! اے بزرگ نجیبوں کے بیٹے!)؟ کیا کسی کو پکارنے اور خطاب کرنے کے لیے مخاطب اور سننے والے کا ہونا ضروری نہیں؟ کیا وہ مخاطب جو ہر پکار کو سن لے، ہر جگہ موجود ہوتا ہے یا نہیں؟

خود اسی دعا کے الفاظ گواہی دے رہے ہیں کہ امام ہر جگہ موجود نہیں؛ کیونکہ اس کے آخری حصے میں کہا گیا ہے: «اللهم فبلغه منا تحية وسلاماً» (اے اللہ! ہمارا سلام اور تحیت امام تک پہنچا دے)۔ اگر امام ہر جگہ حاضر ہیں تو پھر اللہ سے یہ کہنے کی کیا ضرورت کہ "ہمارا سلام ان تک پہنچا دے"؟ کیا وہ خود نہیں سن رہے؟ کتاب 'کافی' اور 'وسائل الشیعہ' (باب زيارة النبي من بعيد) میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "میں اپنی امت کا سلام دور سے خود نہیں سنتا بلکہ اللہ کے فرشتے وہ سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں"۔ اب جہاں اللہ کے رسول ﷺ —جو تمام مخلوقات سے اشرف ہیں—ہر جگہ حاضر و شنوا نہیں ہیں، تو ان کا جانشین کیسے ہر جگہ حاضر و شنوا ہو سکتا ہے؟ اگر امام ہر جگہ موجود ہیں تو شیعہ علماء نے یہ روایت کیوں

نقل کی ہے کہ فرشتے ان کے پاس اعمال نامے لے کر جاتے ہیں؟ جب وہ خود موجود ہیں تو پھر نامہ بر کی کیا ضرورت؟

پس جان لیجیے کہ یہ عقلاً محال ہے کہ ایک شخص دو، آٹھ یا ہزاروں مقامات پر ایک ہی وقت میں موجود ہو۔ اگر وہ آٹھ جگہوں پر ہے تو وہ 'ایک' شخص نہیں رہا۔ عقل اسے ناممکن قرار دیتی ہے کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں دو مقامات پر ہو، چہ جائیکہ سینکڑوں مقامات پر۔ ہم عوام سے پوچھتے ہیں: اگر امیر المومنینؑ ہر جگہ حاضر تھے تو انہیں مسجدِ کوفہ میں شہید کیسے کیا گیا؟ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے، تو کیا اس وقت وہ مکہ میں بھی موجود تھے؟ کیا وہ امام جو (بقول تمہارے) ہر جگہ ہے، حماموں، مے خانوں اور فسق و فجور کے مقامات پر بھی موجود ہے؟ اگر ہے، تو کیا وہ تمام عورتوں کا محرم ہے؟ کیا امام بھی خدا کی طرح ہر قسم کی شرعی تکلیف (ذمہ داری) سے آزاد ہے اور اس کے لیے حلال و حرام کی کوئی قید نہیں؟ اگر وہ شرعی طور پر مکلف ہیں، تو وہ ہر جگہ موجود ہو کر بھی 'نہی عن المنکر' (برائی سے روکنا) کیوں نہیں کرتے اور ان برائی کے اڈوں کو ختم کیوں نہیں کرتے؟ اگر کوئی کہے کہ "خدا بھی تو ہر جگہ ہے مگر وہ (جبراً) نہیں روکتا"، تو جواب یہ ہے کہ خدا مکلف نہیں ہے، اس نے اپنے لیے یہ نہیں فرمایا کہ "جو نازل ہوا اس کی پیروی کرو"؛ لیکن رسول، امام اور دیگر سب کو حکم دیا ہے: ﴿ ٱتَّبِعُواْ مَآ أُنزِلَ إِلَيۡكُم مِّن رَّبِّكُمۡ ﴾ (تمہارے رب کی طرف سے جو نازل کیا گیا، اس کی پیروی کرو)۔ پس امام مکلف ہے اور اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہو اور برائی کو نہ روکے۔

خود حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ (خطبہ ۴۶) میں شام کی روانگی کے وقت فرمایا:

«اللَّهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ، وَأَنْتَ الْخَلِيفَةُ فِي الأَهْلِ، وَلاَ يَجْمَعُهُما غَيْرُکَ...»

"اے اللہ ! تو ہی سفر میں ساتھی ہے اور تو ہی پیچھے گھر والوں کا نگران و جانشین ہے، اور تیرے سوا یہ دو صفتیں کسی میں جمع نہیں ہو سکتیں؛ کیونکہ جو پیچھے نگرانی کرے وہ ساتھ نہیں ہو سکتا، اور جو ساتھ ہو وہ پیچھے نگران (جانشین) نہیں ہو سکتا"۔

پس اس خطبے میں حضرتؑ فرما رہے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی دو جگہوں پر بھی نہیں ہو سکتا، ہزاروں جگہوں کی تو بات ہی الگ ہے۔

عقلی تضاد کی ایک اور مثال دعا کا یہ جملہ ہے: «یابن الطور والعادیات یابن یس والذاریات» (اے کوہِ طور اور دوڑنے والے گھوڑوں کے بیٹے ! اے یٰسین اور اڑنے والی ہواؤں کے بیٹے !)۔ یہ جملہ امام کے عالی مقام کی توہین ہے اور عقل کے سراسر خلاف بھی۔ امام کسی پہاڑ یا دوڑنے والے گھوڑوں کی اولاد نہیں ہے۔ کیا شیعوں کو حیا نہیں آتی کہ وہ ایسے جملے پڑھتے ہیں؟ اگر کوئی کہے کہ "امام سجادؑ نے بھی تو فرمایا تھا کہ 'میں مکہ و منیٰ کا بیٹا ہوں، میں زمزم و صفا کا بیٹا ہوں'، تو دعائے ندبہ بھی اسی طرح ہے"؛ تو جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں ! کیونکہ جو شخص جس شہر یا بستی میں پیدا ہو کر پروان چڑھتا ہے، اسے وہاں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے (جیسے قمی یا کاشانی)۔ چونکہ حضرت سجادؑ اور ان کے آباؤ اجداد مکہ، مدینہ، زمزم اور صفا میں رہے، اس لیے انہوں نے فرمایا کہ "میں مکہ و صفا کا بیٹا ہوں"۔ لیکن امامِ زمانہ نہ تو خود کوہِ طور پر رہے اور نہ ان کے آباؤ اجداد۔ مزید برآں، گھوڑوں (العادیات) اور ہواؤں (الذاریات) کی اولاد ہونے کا کیا مطلب؟ بہرحال، ہم ایک بے سند دعا کی خاطر امامِ زمانہ کی ایسی توہین کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔

دعائے ندا بہ کفر و شرک پر مبنی ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی سینکڑوں آیات میں یہ حکم دیا ہے کہ "غیر اللہ کو نہ پکارو" اور غیر اللہ کو پکارنے کو کفر و شرک قرار دیا ہے۔ سورہ جن (آیت ۱۸) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا تَدۡعُواْ مَعَ ٱللَّهِ أَحَدٗا ﴾

"پس اللہ کے ساتھ کسی ایک کو بھی نہ پکارو۔"

اسی سورہ کی آیت ۲۰ میں فرمایا:

﴿ قُلۡ إِنَّمَآ أَدۡعُواْ رَبِّي وَلَآ أُشۡرِكُ بِهِۦٓ أَحَدٗا ﴾

"آپ کہہ دیجیے کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔"

سورہ احقاف (آیت ۵-٦) میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَنۡ أَضَلُّ مِمَّن يَدۡعُواْ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَن لَّا يَسۡتَجِيبُ لَهُۥٓ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِ... ﴾

"اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کے سوا ایسوں کو پکارتا ہے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے، اور وہ ان کی پکار سے بالکل غافل ہیں۔ اور جب لوگ (قیامت کے دن) جمع کیے جائیں

گے تو وہ (معبودانِ باطل) اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی عبادت (و دعا) کا صریح انکار کر دیں گے۔"

سورہ اعراف (آیت ۱۹۴) میں فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ تَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ عِبَادٌ أَمۡثَالُكُمۡ... ﴾

"بے شک تم اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو، وہ تمہی جیسے بندے ہیں۔ پس تم انہیں پکار کر دیکھو، اگر تم سچے ہو تو انہیں چاہیے کہ تمہیں جواب دیں۔"

سورہ فاطر (آیت ۱۳-۱۴) میں ارشاد ہے:

﴿ وَٱلَّذِينَ تَدۡعُونَ مِن دُونِهِۦ مَا يَمۡلِكُونَ مِن قِطۡمِيرٍ... ﴾

"اور اس کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے (قطمیر) کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے، اور اگر (بالفرض) سن بھی لیں تو تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتے، اور قیامت کے دن وہ تمہارے (اس) شرک کا انکار کر دیں گے۔ اور تجھے ایک باخبر (اللہ) کی طرح کوئی دوسرا خبردار نہیں کر سکتا۔"

ان آیات میں غیر اللہ کو پکارنے والے کو "مشرک" اور "کافر" کہا گیا ہے۔ ان میں استعمال ہونے والے الفاظ جیسے «الذین» (وہ لوگ)، «عباد أمثالکم» (تم جیسے بندے)، ضمیر جمع مذکر «هم» (وہ سب) اور اسمِ موصول «من» (جو کہ)، یہ سب کے سب ذوی العقول (عقل رکھنے والے بندوں) پر صادق

آتے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ ہم انہیں "بتوں" پر محمول کریں اور یہ کہیں کہ ان سے مراد صرف لکڑی اور پتھر کے بت ہیں۔

ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ یا کسی امام نے یہ فرمایا ہو کہ "اپنی حاجتوں میں ہمیں پکارا کرو"؛ بلکہ انہوں نے تو ہمیشہ غیر اللہ کو پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿ إِنَّآ أَرۡسَلۡنَٰكَ شَٰهِدٗا وَمُبَشِّرٗا وَنَذِيرٗا وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ ﴾

"بے شک ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا، ڈرانے والا اور اللہ کی طرف دعوت دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

اور سورہ آلِ عمران (آیت ۸۰) میں صراحت فرمائی:

﴿ وَلَا يَأۡمُرَكُمۡ أَن تَتَّخِذُواْ ٱلۡمَلَٰٓئِكَةَ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ أَرۡبَابًا... ﴾

"اور وہ (اللہ) تمہیں ہرگزیہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو۔ کیا وہ تمہیں تمہارے مسلمان ہونے کے بعد کفر کا حکم دے گا؟"

پس ثابت ہوا کہ امام کو "رب" (حاجت روا) کے درجے پر فائز کرنا اور انہیں پکارنا صریحاً غلط اور کفر ہے۔

مشرکین کے دلائل اور شبہات کا ازالہ

یہ لوگ غیر اللہ کو پکارنے اور ان سے دعا مانگنے کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ: "جس طرح ہم اپنے باپ کو پکار کر جوتا یا ٹوپی مانگتے ہیں، دکاندار سے پنیر مانگتے ہیں، یا کسی دولت مند سے اپنی ضرورت پوری کرنے کی درخواست کرتے ہیں اور اگر وہ حاجت پوری کر دے تو اسے 'قاضی الحاجات' (حاجتیں پوری کرنے والا) سمجھا جاتا ہے اور یہ ایک اچھا کام ہے؛ تو پھر امام کو پکارنا شرک کیوں ہے؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ باپ، دکاندار یا کسی غنی کو پکارنا ایک **عرفی** اور **دنیاوی معاملہ** ہے جو روزمرہ کے معمولات اور متعارف خطابات کا حصہ ہے، اس کے لیے کسی شرعی نص یا حکم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن "شرعی دعا" ایک **غیبی پکار** ہے جو عرفی خطابات جیسی نہیں ہوتی، اس کے لیے شرع کا حکم ہونا لازمی ہے۔ عرفی خطاب میں مخاطب حاضر اور سامنے ہوتا ہے۔ کیا اگر تمہارا باپ فوت ہو چکا ہو، تب بھی تم اسے پکار کر کہتے ہو کہ "ابا! ٹوپی دو"؟ یا اگر دکاندار مر چکا ہو تو کیا اس سے پنیر مانگتے ہو؟ ہرگز نہیں!

جبکہ شرعی دعا ایک **عبادت** ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: «الدعاء أفضل العبادة بعد قراءة القرآن» (دعا قرآن کی قرأت کے بعد بہترین عبادت ہے) اور فرمایا: «الدعاء مخ العبادة» (دعا عبادت کا مغز اور حقیقت ہے)۔ چونکہ دعا عبادت ہے، اس لیے یہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے اور اس میں کسی غیر کو پکارنا جائز نہیں۔ اللہ نے سو سے زائد آیات میں حکم دیا ہے کہ شرک نہ کرو اور میرے سوا کسی کو نہ پکارو۔

دوسرا شبہ: یہ لوگ کہتے ہیں کہ "اگر ہمیں بادشاہ سے کام ہو تو پہلے اس کے وزیر یا مشیر کے پاس جانا پڑتا ہے"۔

جواب یہ ہے کہ بادشاہ چونکہ ہر جگہ موجود نہیں ہوتا، وہ اپنی رعایا کے حال سے بے خبر ہوتا ہے اور اس تک براہِ راست رسائی ممکن نہیں ہوتی، اس لیے وزیر کا واسطہ ضروری ہے۔ مگر اللہ ایسا نہیں ہے؛ وہ اپنے سمع، بصر اور علم کے ساتھ ہر جگہ حاضر ہے، اپنے بندے کے حال سے باخبر اور اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ اسے کسی وزیر یا واسطے کی ضرورت نہیں۔ خدا کو بادشاہ پر قیاس کرنا تشبیہ ہے، جبکہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے: «من شبہ الخالق بالمخلوق فہو مشرک» (جس نے خالق کو مخلوق سے تشبیہ دی وہ مشرک ہے)۔

تیسرا شبہ: یہ کہتے ہیں کہ "ہم گنہگار اور روسیاہ ہیں، ہمیں اللہ کو پکارتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

جواب یہ ہے کہ تمہیں غیر اللہ کو پکارتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟ تمہاری سیاہ کاریوں سے اللہ تو واقف ہے ہی، خواہ تم اسے پکارو یا نہ پکارو۔ تو بہتر یہ ہے کہ اسی باخبر خدا ہی کو پکارو اور دوسروں کو اپنی برائیوں سے مطلع نہ کرو۔ اللہ اس بات پر راضی نہیں کہ بندے کے گناہوں کا علم اس کے سوا کسی کو ہو؛ اس لیے کسی رسول، امام، مرشد یا پادری کے پاس جا کر گناہوں کا اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ "ستار العیوب" ہے اور اس نے خود فرمایا ہے کہ "مجھے پکارو، میں تم سے قریب تر اور سب سے زیادہ مہربان ہوں"۔ کوئی رسول یا امام اللہ سے زیادہ رحیم نہیں ہو سکتا۔ یہ انسان کی بدبختی ہے کہ اللہ تو فرمائے: ﴿ ٱدۡعُونِيٓ أَسۡتَجِبۡ لَكُمۡ ﴾ (مجھے پکارو میں جواب دوں گا) اور بندہ اعراض کر کے کہے: "نہیں! میں تیرے بندے کو پکارتا ہوں"۔

چوتھا شبہ: یہ کہتے ہیں کہ "جس طرح بلب کو روشن ہونے کے لیے تار اور تار کو پاور ہاؤس (بجلی گھر) سے جڑنا پڑتا ہے، اسی طرح ہمیں امام کا دامن تھامنا ہے تاکہ وہ اللہ تک پہنچا دے"۔

واقعی یہ لوگ یا تو سمجھتے نہیں یا جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں ! اے نادان ! بجلی گھر دور ہوتا ہے اس لیے تار کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ دور نہیں ہے کہ اسے جوڑنے کے لیے کسی تار (واسطے) کی ضرورت پڑے۔ بجلی گھر محدود اور (وسائل کا) محتاج ہے، جبکہ اللہ کی ذات ایسی نہیں ہے۔ تمہاری یہ تشبیہ کفر و شرک ہے۔ پھر یہ کہ امام (جسمانی طور پر) یہاں حاضر نہیں ہے، تو تم ان کا کون سا دامن تھاموگے؟

پانچواں شبہ: یہ کہتے ہیں کہ "پیغمبر اور امام اللہ کے مقرب ہیں"۔

جواب یہ ہے کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ "مقربین کو پکارو" بلکہ فرمایا ہے "مجھے پکارو"۔ اللہ کے سوا کوئی بھی ہر جگہ حاضر نہیں۔ یہ لوگ گویا اسلام اور قرآن سے کلی طور پر بے خبر ہیں۔

چھٹا شبہ: "کیا آپ 'وسیلہ' کو نہیں مانتے؟"

ہم وسیلہ کو مانتے ہیں، لیکن وہ وسیلہ جو خود حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ (خطبہ ۱۰۹) میں بیان فرمایا ہے، یعنی: "توسل کرنے والوں کے لیے بہترین وسیلہ اللہ پر ایمان لانا ہے"۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا: "الٰہی ! تیرے حضور میرا وسیلہ میرا ایمان ہے"۔ رہی بات انبیاء اور ائمہ کی، تو وہ 'ارشاد' (رہنمائی)، وحیِ الٰہی پہنچانے اور ہدایت کا وسیلہ ہیں، نہ کہ دعا میں پکارنے کا وسیلہ۔ یاد رہے کہ "دعائے توسل" یا "یا محمد و یا علی اکفیانی" جیسی دعاؤں کی کوئی سند نہیں ہے، بلکہ یہ کفر و شرک ہیں۔ پس دعائے ندبہ، جس میں امامِ زمانہ کو پکارا جاتا ہے، قرآنی دلائل کی روشنی میں توحید کے خلاف اور کفر و شرک کے موافق ہے۔

اب اگر کوئی حقیقت جاننے کے باوجود ضد کرے، سجدے میں گر کر پاؤں ہوا میں لہرائے اور کہے کہ "اے امام میں آپ کا کتا ہوں، عوعو" یا "مہدی جون مہدی جون" کہہ کر امام کی توہین کرے، تو ایسے شخص کو خوابِ غفلت و جہالت سے بیدار کرنا ضروری ہے۔

من آنچه شرط بلاغست با تو می گویم

تو خواه از سخنم پند گیر و خواه ملال

(میرا کام حق پہنچا دینا تھا، اب تمہاری مرضی کہ نصیحت حاصل کرو یا رنجیدہ ہو جاؤ)۔

ہمیں ان لوگوں سے کوئی امید نہیں جو جہالت اور خرافات میں ڈوبے ہوئے ہیں، کیونکہ خرافات کے علمبردار اپنی انا کے گھوڑے سے اترنے کو تیار نہیں۔ اگر وہ ہماری بات تسلیم نہیں کرتے تو دلیل لے کر آئیں، ہم عناد نہیں رکھتے اور حق تسلیم کر لیں گے۔ لیکن اگر وہ گالی گلوچ، بہتان تراشی اور ہنگامہ آرائی پر اتر آئے، تو یہ ان کے متعصب، بے دلیل اور جاہل ہونے کی علامت ہوگی۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ

سید علی احمد موسوی واعظ - مشہد